بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ اشاعت میں ہم نے صدر مملکت جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کی تصنیف "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کے متعلق چند ملاحظات پیش کیے تھے۔ ان صفحات میں ہم اسی سلسلے کے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

صدر صاحب نے ستر صفحات پر پھیلے ہوئے دو ابواب میں خاصی تفصیل کے ساتھ پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بحث فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انہوں نے اس پالیسی کے تشکیل دینے میں کن مصالح کو پیش نظر رکھا ہے، اُن کی بصیرت اور تدبّر نے بیرونی دنیا میں پاکستان کا وقار کتنا بلند کیا ہے۔ اور یہ کہ پہلے حکمرانوں سے اس معاملے میں کیا کیا لغزشیں سرزد ہوئیں اور ان کی وجہ سے پاکستان کو کیا نقصان پہنچا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے دو اہم مقاصد ہیں ایک ملک کی سلامتی اور دوسرے ترقی۔ پھر انہوں نے ترقی کی تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم محض ترقی کے خواہشمند نہیں بلکہ اُس ترقی کے آرزومند ہیں جو ہمارے دین اور مذہب کے مطابق ہو۔ (ص ۱۱۴)

اس کے بعد انہوں نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ موجودہ دنیا دراصل دو یا تین یا چار بڑی طاقتوں کی دنیا ہے۔ نوعِ بشری کی قسمت کے فیصلے انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ چھوٹے ممالک، جنہیں حال ہی میں آزادی حاصل ہوئی ہے، ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی دنیا خود آباد کرنے کے قابل نہیں ہوئے۔

محولہ بالا دو مقاصد اور دنیا کی موجودہ صورت حال کو سامنے رکھ کر انہوں نے پاکستان کے خارجی مسائل کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں ہندو ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے دلائل کے ساتھ یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس قوم نے پاکستان کے وجود کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور وہ اول روز ہی سے اس تاک میں لگی

ہوئی ہے کہ کسی طرح اس ملک کو مٹا دیا جائے پھر انہوں نے بھارت کی ریشہ دوانیوں، وعدہ خلافیوں اور کشمیر کے معاملے میں اس کی فریب کاریوں پر بھی خاصی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں انہوں نے پاکستان کی اور دنیا کی صورتِ حال کا جو جائزہ پیش کیا ہے اس کے مطالعہ سے ہمیں اپنی کمزور پوزیشن اور معاشی پس ماندگی کا سخت احساس ہوتا ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمیں اپنے حفظ و بقا اور توسیع و ترقی کے لیے لازماً دوسروں کا دست نگر ہونا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک وقت ہم ایک کے محتاج ہوں اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے دوسرے وقت کسی دوسرے کے محتاج ہو جائیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۵۴ء میں جب پاکستان بغداد پیکٹ اور سیٹو میں شریک ہوا تو یہ محض حالات کی مجبوری تھی:

"صبحِ آزادی طلوع ہونے کے ساتھ ہی پاکستان اپنے تحفظ اور بقا کے لیے ایک شدید اور لمبی جنگ میں الجھ گیا اور ۱۹۵۴ء تک وہ اپنی سلامتی کے لیے مغربی طاقتوں کا حلیف بننے پر مجبور ہو گیا" (ص ۱۱۶)

اور اب خارجہ پالیسی میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ بھی بدلے ہوئے حالات کے دباؤ کا نتیجہ ہے (ص ۱)۔

آگے چل کر انہوں نے بڑی صفائی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ امریکہ شروع ہی سے اس بات کا متمنی ہے کہ شرقِ اوسط میں اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لیے ایک محاذ قائم کرنا چاہیے اور یہ محاذ دنیائے اسلام سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اشتراکیت کے خطرے نے تاریخ میں پہلی بار مسیحی دنیا کو دنیائے اسلام کی امداد پر آمادہ کیا ہے۔ مسلمان اس کرۂ ارضی کے ایسے حصے میں آباد ہیں جو معاشی اور فوجی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی بنا پر امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک نے مسلمانوں کو دوست بنانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف دنیائے اسلام اس وقت مغربی طاقتوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر رہی تھی۔ اس حالت میں اسے اپنے انسانی اور مادی وسائل کی ترقی کے لیے مادی

اسباب، فرصت اور صنعتی مہارت درکار تھی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں پس و پیش کرتے۔ ہمارے لیے خود اپنی توسیع و ترقی کے لیے اپنی ضروریات سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتی تھیں اور یہ تھی وہ وجہ جس کی بنا پر ہم نے ان معاہدوں (سیٹو اور سنٹو) میں شمولیت اختیار کی"

(صفحہ ۱۵۴)

اس کے بعد صفحہ ۱۵۷ پر انہوں نے علاقائی تعاون برائے ترقی (R.C.D) کا ذکر کرتے ہوئے بغداد پیکٹ کی اہمیت بتائی ہے اور صاف کہا ہے کہ یہی پیکٹ تھا جس نے آر۔سی۔ڈی کے قیام کے لیے راستہ ہموار کیا۔

ہمارے سامنے ایک طرف صدر صاحب کی یہ تصریحات ہیں۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان معاہدوں کی مخالفت بھی فرما رہے ہیں۔ مثلاً سیٹو کے بارے میں اُن کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

"مجھے اُن وجوہ کا کچھ علم نہیں جو سیٹو میں حکومتِ پاکستان کی شمولیت کے محرک ہوئے۔ اس بارے میں تو چوہدری ظفراللہ ہی سے دریافت کرنا چاہیے جو اُس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ ہم سپاہیوں سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ مجھے خیال ہے کہ جنرل ہیڈ کوارٹرس میں ہمیں اس کا اُس وقت پتہ چلا جب وزیر خارجہ اس معاہدہ پر دستخط کر چکے تھے۔ اُس وقت بھی میری یہ رائے تھی کہ اس معاہدے میں پاکستان کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ غالباً یہ کام زیادہ تر امریکہ کی خوشنودی کے لیے کیا گیا تھا کیونکہ وہ ہمیں معقول معاشی امداد دے رہا تھا۔ اس کے سوا مجھے اس معاہدے میں شریک ہونے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ اس تنظیم کی رکنیت کسی حیثیت سے پاکستان کے مشرقی حصے کی پوزیشن مضبوط کرے گی تو ظاہر بات ہے کہ اس نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ مشرقی پاکستان کو تو اصل خطرہ ہندوستان سے ہے جو اسے تین طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔" (صفحہ ۱۵۷)

ان دونوں قسم کے بیانات کو جو شخص بھی پڑھے گا وہ یقیناً ان کے اندر ایک تضاد محسوس کرے گا۔ متعدد مقامات پر وہ ان معاہدوں کو پاکستان کی ناگزیر ضرورت بھی بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف بعض

مشرقی ممالک کے درمیان تعاون کی راہ ہموار کی ہے بلکہ امریکہ سے فنی اور معاشی امداد کے لیے بھی ایک راستہ کھول دیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ان کی مخالفت میں بھی دلائل دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان معاہدوں کی وجہ سے روس ہم سے ناراض ہو گیا اور عرب ممالک، خصوصاً مصر اور اس کے ساتھیوں نے بھی ہمیں امریکہ کا پٹھو سمجھتے ہوئے ہم سے مُنہ موڑ لیا اور وہ ہمارے مقابلے میں بھارت کی طرف جھکنے لگے۔

صدر صاحب نے اِن معاہدوں کے خلاف جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے، اِن سے واقعی دنیا میں ہماری پوزیشن خراب ہوئی ہے اور بعض قوموں کے دلوں میں ہمارے خلاف ایسے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں کہ ابھی تک کوشش کے باوجود ہم انہیں دُور نہیں کر سکے۔ مگر ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے باوجود وہ ابھی تک اِن معاہدوں سے کیوں آزاد نہیں ہوتے پہلی حکومتوں نے اگر ان معاہدوں میں شمولیت کی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کی افادیت کی قائل تھیں لیکن اب تو تجربہ سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ یہ معاہدے ہمارے لیے محض بیگار کی زنجیریں ہیں جن سے ہمیں اچھا خاصا نقصان پہنچا ہے۔ اور صدر صاحب خود واشگاف طریقہ سے ان کے ضرر رساں پہلوؤں کو بیان کر رہے ہیں۔ اب ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس احساس اور برملا اعتراف کے باوجود وہ اِن معاہدوں سے اپنے آپ کو الگ کرنے پر کیوں آمادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنے اس موقف پر روشنی ڈال کر اُن الجھنوں کو دُور کر دیتے جو ان کے یہ مختلف ارشادات پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔

صدر مملکت نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں جتنی باتیں کی ہیں اُن میں بعض ناقابلِ تردید حقائق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک حقیقت دنیا کی غیر مسلم قوموں کی اسلام دشمنی ہے۔ کفر کی صفوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف اور انتشار ہو، اسلام کے مقابلے میں وہ بالکل متفق اور متحد ہیں۔ کفر کی اس روش کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"کاسابلنکا سے لے کر جکارتہ تک کے علاقے میں جتنے ممالک پائے جاتے ہیں وہ دنیا

کی بڑی طاقتوں کی نظر میں مشکوک بھی ہیں کیونکہ ان کی عظیم اکثریت دین اسلام کی پیرو ہے۔ اسلام کے بارے میں خود ان مسلم ممالک کے درمیان اندرونی طور پر جو کچھ بھی اختلاف ہو، اور ہر ایک نے اسلام کے متعلق جو نقطۂ نظر بھی اختیار کیا ہو، بہرحال یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اشتراکی دنیا، مسیحی دنیا اور ہندو بھارت، سب کے سب مسلم ممالک کے ساتھ انہیں مسلم سمجھ کر ہی معاملہ کرتے ہیں۔" (ص ۱۸۳)

ایک اور مقام پر وہ پاکستان کے مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ پاکستان کی حفاظت ہمیں خود ہی کرنی ہوگی۔ کوئی دوسرا ملک ہماری طرف سے مدافعت نہیں کرے گا ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو اپنے مسائل درپیش ہیں اور حالات کے تغیر سے اُن کے طرزِ عمل میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس طرح ہم بالکل بے یار و مددگار بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ نازک مقام ہے جہاں قادرِ مطلق ہی ہماری دستگیری کر سکتا ہے۔" (ص ۱۲۱)

غیر مسلم ممالک کی اسلام دشمنی کے متعلق یہ ارشادات بالکل بجا ہیں اور مسلمانوں کو اپنی قوتِ ایمانی اور اپنے وسائل پر جینے کی یہ تلقین بالکل درست ہے۔ مگر صدر صاحب کی کتاب کے اِن دو ابواب کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعی صورتِ حال کو جانتے ہوئے بھی وہ ابھی تک مغربی قوموں سے مایوس یا بدظن نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک طرف انہیں برابر اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے ہیں اور دوسری طرف اپنی قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ دنیا، جس میں ہم رہتے ہیں، وہ چار طاقتوں کی دنیا ہے، ان کی معاونت اور دستگیری کے بغیر ہمارا زندہ رہنا اور ترقی کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس ضمن میں اُن کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

"ترقی کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے اُس کے لیے ذرائع موجود ہوں۔ اور یہ سارے ذرائع ہمارے موجودہ معاشرتی حالات اور ہمارے نظامِ اقدار میں محض حکم چلا کر نہ پیدا کیے جا سکتے

ہی حرکت میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس لیے لامحالہ ہمیں اجتماعی تعمیر کے اٹھان اور ابتدائی سرمایہ کاری کی فراہمی کیلیے بیرونی امداد کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے ہمارے لیے امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا ضروری ہے جو معاشی طور پر ہماری مدد کر سکتی ہیں۔" (ص ۱۱۸)

یہاں اور بعض دوسرے مقامات پر صدر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اُس سے ہمیں اپنی مجبوری کا سخت احساس ہونے لگتا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان مغربی طاقتوں کی مدد کے بغیر ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ خواہ ہمارے ساتھ ان کا رویّہ کیسا ہی معاندانہ اور غیر منصفانہ ہو اور خواہ وہ مسلمان ہونے کی بنا پر ہم سے کیسا ہی تعصب برتیں۔ اِس مجبورانہ دست نگری کے بعد مشکل ہی سے ہم کسی آزاد خارجہ پالیسی کا تصور کر سکتے ہیں۔

اسی ضمن میں صدر محترم نے یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ دورِ جدید میں اگر قومیں خود اپنے وسائل کے بل بوتے پر زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی خواہشمند ہوں تو اس کی صورت بس ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ آقدار کا موجودہ نظام درہم برہم کر کے اُس کی جگہ ایک ایسا نظام لایا جائے جو فرد کو اجتماعی نظم و ضبط کی جکڑ بندیوں میں پوری طرح کس کر اُس سے کام لے۔ واضح الفاظ میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ صدر صاحب کی نگاہ میں اب ہمارے لیے توسیع و ترقی کی صرف دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہم مغربی طاقتوں کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اُن سے مدد مانگتے رہیں۔ یا پھر اپنی تہذیب و تمدن کو خیر باد کہکر اُس کی جگہ اشتراکی نظام اپنے ہاں رائج کر دیں۔ ہم حیران ہیں، کیا واقعی اب مسلم قوم کی بقا و فلاح کے صرف یہی دو راستے رہ گئے ہیں؟ صدر صاحب نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر اسلام کی بے حد مدح و ستائش کی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اقدار کے موجودہ نیم اسلامی اور نیم غیر اسلامی نظام کو ختم کر کے ان کی جگہ اپنے ہاں صحیح معنوں میں مکمل اسلامی نظام اقدار نافذ کریں اور قوت و طاقت کے اُس اتھاہ خزانے سے، جس کی جڑیں ہمارے دل و دماغ کی گہرائیوں میں موجود ہیں، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر اپنے وسائل کے بل بوتے پر زندہ رہنے کے ڈھنگ سیکھیں؟ مسلم قوم قدرتی ذرائع کے اعتبار سے اتنی قلاش اور ہمت کے اعتبار سے اتنی پست نہیں ہے کہ غیروں

کے سہارے کے بغیر اس کا جینا قطعاً ممکن نہ ہو۔ پھر اس کا نظامِ اقدار بھی کوئی ایسا بیکار اور لایعنی نہیں کہ اُسے مٹائے بغیر ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا ہو۔ اِسی نظام کی قوت سے اس نے قریب قریب آٹھ سو سال تک دنیا کی فکری اور عملی رہنمائی کی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس نظام کو دل و جان سے اپنا لیا جائے۔

اِس طرح کی مجبوری اور لاچاری کی باتیں ممکن ہے سابق حکمرانوں کو زیب دیتی ہوں جن کی نااہلی اور کمزوری پر صدر صاحب نے خود شہادت دی ہے۔ مگر صدر صاحب جیسے طاقتور اور صاحبِ عزم و حوصلہ شخص کو تو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اور ان کی نگاہ سے یہ تاریخی حقیقت بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ کسی قوم نے دنیا میں غیروں کی نقالی اور دستگیری سے عزت کا مقام کبھی حاصل نہیں کیا ہے۔ مدد دینے والا کبھی مدد لینے والوں کو اس قابل نہیں بننے دیتا کہ وہ اس کی محتاجی سے آزاد ہو جائے۔ اور کوئی قوم جو اپنی کوئی تہذیب اور اپنا کوئی نظامِ اقدار رکھتی ہو، باہر سے لایا ہُوا ایک نظامِ حیات درآمد کر کے انتشار و خلفشار کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتی۔ اس معاملہ میں ہمارا اپنا ۲۰ سال کا تجربہ اور شرقِ اوسط کے بعض ملکوں کا تجربہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اِس کتاب کے اِن دو ابواب کے مطالعہ سے قاری ایک مقام پر نہیں بلکہ کئی مقامات پر اسی نوعیت کی اُلجھن محسوس کرتا ہے۔ کبھی تو اُس کو یہ تاثر ملتا ہے کہ دنیا کی ساری غیر مسلم قومیں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتتی ہیں، اُن پر کسی حالت میں اعتماد نہ کرنا چاہیے اور اللہ پر بھروسہ کر کے خود اپنی ہمت اور طاقت سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور کبھی یہ تاثر ملتا ہے کہ ان بڑی قوموں کی معاونت اور دستگیری کے بغیر ہماری ترقی تو درکنار ہمارا جینا بھی ناممکن ہے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ بس یہ کہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کریں تاکہ کسی آستانے سے خالی ہاتھ واپس نہ آئیں۔ یہ غالباً اسی تذبذب کا نتیجہ ہے کہ صدرِ محترم امریکہ کے ناپاک عزائم اور ماضی میں اُس کے ناقابلِ اعتماد کردار اور مستقبل کے تشویشناک رجحانات کو جانتے ہوئے بھی اُس کے بارے میں کوئی فیصلہ کُن پالیسی طے نہیں کر سکے۔ امریکہ نے جس طرح پاکستان کے مفادات کو نظر انداز کرتے

ہوتے بھارت کو اسلحہ فراہم کرنا شروع کیا اُس سے اُس کے خبثِ باطن کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ خود صدر محترم نے اپنی تصنیف میں اس کا باربار ذکر فرمایا ہے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے ۱۹۶۱ء میں امریکی کانگرس کو خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا:

"وہ قوم جو ہمیشہ آپ کا ساتھ دیگی وہ صرف پاکستانی قوم ہی ہے ۔ ۔ ۔ بشرطیکہ آپ بھی اس کے ساتھ ٹکڑے ہونے کو تیار رہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کی معاہدانہ ذمہ داریوں کے تقاضے خواہ کچھ بھی ہوں، آپ ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں جس سے ہمارے مسائل کی الجھنیں بڑھ جائیں یا کسی طرح ہماری سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ اگر آپ اس بات کا پاس کرتے رہیں گے تو مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہماری دوستی مضبوط تر ہوتی جائے گی (ص ۱۳۱)

یہ معاملہ صرف زبانی یقین دہانی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ صدر محترم نے بعض فیصلہ کن مواقع پر وہی اقدام کیا ہے جس کا امریکہ خواہشمند تھا۔ ہم یہاں صرف اس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں جسے صدر صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

جب بھارت اور چین کے درمیان آویزش شروع ہوئی تو امریکہ کو یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ کہیں پاکستان اس موقع پر کشمیر کا جھگڑا اٹھا کر بھارت کو پریشان نہ کرے۔ اس لیے وہ اس بات کا خواہشمند تھا کہ پاکستان کا سربراہ بھارت کو اس امر کا یقین دلا دے کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے گا جس سے اُس پر کسی قسم کا دباؤ پڑے۔ صدر محترم نے بھارت کی وعدہ خلافیوں اور زیادتیوں کے متعلق نومبر ۱۹۶۲ء میں صدر کینیڈی کو ایک زوردار خط تحریر کیا، مگر اس کے ساتھ ہی امریکہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بھارت کو بھی ایک خط لکھ بھیجا جس میں اُس کے دلی اضطراب کو سکون سے بدلنے کی پوری طرح کوشش کی گئی تھی۔ امریکہ کو اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ صدر ایوب خود پنڈت نہرو سے ملاقات کرکے انہیں اطمینان دلائیں۔ چنانچہ ہمارے صدر محترم نے ایسا ہی کیا اور ۷ نومبر ۱۹۶۲ء کو ان دونوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس کا متن یہ تھا:

"پاکستان کے صدر اور بھارت کے وزیراعظم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ کشمیر اور بعض دوسرے امور کے بارے میں ان کے درمیان جو اختلافات ہیں انہیں دُور کرنے کے لیے از سرِ نو کوشش کی جائے تاکہ بھارت اور پاکستان امن اور دوستی کے ساتھ زندہ رہیں۔" (ص ۱۴۹)

صدر صاحب خود جانتے تھے کہ بھارت کشمیر کے مسئلے میں پاکستان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے پر کتنا کچھ آمادہ ہو سکتا ہے۔ اور ان سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ امریکہ کا رویّہ اب کشمیر کے معاملہ میں کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے امریکہ کو راضی رکھنے کے لیے نہرو صاحب کے ساتھ متفق ہو کر اس اعلان پر دستخط کر دیئے۔ وقت گزر جانے کے بعد بھارت نے کشمیر کا مسئلہ سلجھانے کی جیسی کچھ کوشش کی اس کے متعلق صدر صاحب کا اپنا بیان یہ ہے:

"بھارت والے محض وقت گزارنا چاہتے تھے۔ وہ مغرب سے اسلحہ کی بھاری مقدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی یہ قیمت کوئی بڑی قیمت نہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے مشترکہ بیان پر دستخط کر دیئے جس میں کشمیر کے مسئلہ پر پس گفتگو کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ہمیں (گفت وشنید کے دوران میں) اچھی طرح معلوم تھا کہ امریکہ کی براہِ راست دلچسپی کے بغیر ہندوستان (کشمیر کے معاملہ میں) اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہ ہوگا، مگر امریکہ کا خیال یہ تھا کہ بحالاتِ موجودہ امریکہ کا اس گفت وشنید میں براہِ راست حصّہ لینا مفید نہ ہوگا۔ اس طرح تاریخ نے جموں اور کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے جو زرّیں موقع فراہم کیا تھا وہ ضائع ہو گیا۔" (ص ۱۵۲)

امریکہ نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کیا بلکہ خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان کو پریشانی سے بچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گیا۔ صدر محترم اسے امریکہ کے غلط اندازے سے تعبیر فرماتے ہیں، لیکن یہ اُس کا غلط اندازہ نہ تھا بلکہ سوچی سمجھی چال تھی جو وہ بڑی کامیابی کے ساتھ چل گیا اور ہمیں بعد میں اس بات کا پتہ چلا کہ ہم نے زرّیں موقع کھو دیا ہے۔

خارجہ پالیسی کے بعد صدرِ محترم نے پاکستان کی آئیڈیالوجی اور دستور پر مفصل بحث فرمائی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اسلام ایک ایسا جامع نظامِ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے اور اسی کو ہمارے دستور اور آئین کی اساس اور بنیاد ہونا چاہیے مگر اس معاملے میں چند اُلجھنیں درپیش ہیں جنہیں ہمیں دُور کرنا ہے۔ یہ بحث صدر صاحب کی کتاب کا بڑا اہم حصّہ ہے، اس لیے ہم پُوری احتیاط کے ساتھ اس کو سمجھنے اور اس کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ سب سے پہلے ہم ان کا تصورِ دین پیش کرتے ہیں جسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"اسلام زندگی کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اسلامی نظامِ شریعت ایک پوری تہذیب کا ضابطہ ہے۔ آخر یہ ممکن بھی کیسے ہے کہ انسانی زندگی کو مذہب اور مادّی معاملات کے دو الگ خانوں میں بانٹ دیا جائے اور دونوں خانوں کے قوانین جُدا جُدا ہوں؟ اسلام میں سارے انسانی افعال ایک ہی اصُول کے مطابق طے پاتے ہیں۔ جب حیات انسانی وحدت ہے تو اس کے آئین وضوابط میں بھی وحدت ہی ہونی چاہیے۔ ایک انسان خواہ گھر میں ہو، خواہ اپنے کام پر ہو، یا عبادت میں مشغول ہو، ایک ہی نوعیت کا ضابطۂ حیات اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ جن اصولوں کے مطابق ہم اپنے گھر کے معاملات طے کرتے ہیں وہی دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہمارے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔ اسلام میں روز مرّہ زندگی کے ضابطۂ اخلاق سے الگ کوئی دوسرا خاص روحانی ضابطہ نہیں ہے۔ انسان کے بارے میں بحیثیت مجموعی ہی فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کے اعمال کی قدر و قیمت اخلاقی نقطۂ نظر ہی سے متعین ہوتی ہے۔" (ص ۱۹۵-۱۹۶)

اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسلام آج بھی ایک انقلاب انگیز قوتِ فکر و عمل ہے اور وہ ترقی کی راہ میں مزاحم ہونے کے بجائے انسان کو اُس کے لیے آمادہ کرتی اور اُبھارتی ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمانوں کی دینی آرزوؤں اور اُمنگوں کا مظہر ہے اور یہاں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظریہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مغربی افکار و نظریات سے متاثر جدید طبقوں اور قدیم طرز کی تعلیم سے بہرہ مند علماء کی ذہنی آویزش

کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے اور اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ جب یہ دونوں گروہ اسلام کو دل و جان سے مانتے ہیں اور دونوں پاکستان کو ایک طاقتور اور ترقی پذیر ملک دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو ان کے درمیان اس قدر سخت نزاع و اختلاف کیوں ہے۔ (صفحہ ۱۹۵)

ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد وہ اُس بیماری کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں جس نے ہمارے معاشرے کی فطری وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس معاملے میں وہ فساد کے اصل مرکز کی بالکل صحیح طور پر نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عمل کے میدان میں ہماری زندگی دو مختلف دائروں میں بٹی ہوئی ہے اور ہم ہر دائرے میں الگ الگ اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کس طرح اس دلدل سے نکل کر زندگی کے بارے میں ایک مربوط اور یکساں روش اختیار کریں۔ اگر ہم اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہے تو ہماری ترقی رُک جائے گی اور ہم زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ پس ماندگی اور غلامی دونوں مترادف الفاظ ہیں اور ذاتی تجربے سے ہم اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔" (صفحہ ۱۹۶)

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ صدر محترم اسلام کو ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی سمجھتے ہیں۔ زندگی کو دو الگ شعبوں میں تقسیم کرنا اور مذہب کو صرف ایک شعبے تک محدود رکھ کر باقی معاملات کو اس سے آزاد رکھنا ان کے نزدیک غلط ہے۔ مسلم معاشرے میں جدید و قدیم کی آویزش پر بھی انہیں دلی افسوس ہے اور وہ اس خلیج کو پاٹنے کے آرزومند ہیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے ان مختلف طبقوں میں فکر و عمل کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی اختلاف ہو مگر بنیادی اصول اور مقصد میں ان کے درمیان اتفاق ہے۔

اس کے بعد وہ اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ ہم کس طرح دورِ جدید میں اپنے معاشرے کو اسلامی نظامِ حیات کا نمونہ بنائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی اصولوں کو چھانٹ کر متعین کر دینے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم علماء کی مدد سے یا ان کی مدد کے بغیر ان کو خود متعین کریں اور فرمان

(DECREE) کے ذریعہ سے ان کو نافذ کر دیں، مگر میں نے اس راستے کو اختیار نہیں کیا (ص ۱۹۷، ۱۹۸)
پھر جو دوسرا راستہ انہوں نے پسند کیا اس کی تشریح وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اب مسئلہ یہ ہے کہ قوم اسلامی اصولوں کا کس طرح ٹھیک ٹھیک تعیّن اور ادراک کرے۔ اس کے لیے کوئی واضح اور تشفی بخش جواب نہ تھا۔ اسلامی دستور کی کوئی نظیر بھی نہ ملتی تھی۔ قرآن مجید نے اس سلسلے میں کچھ رہنما اصول دیئے ہیں مگر ملک کے معاملات چلانے کے لیے اُس نے کوئی جامع دستور مرتب نہیں کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز پر مملکت کی تشکیل کی اُس کی تفصیل البتہ ہمیں معلوم ہے۔ حضورؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد چاروں خلفاء نے اپنی فہم و فراست کے مطابق اسلامی اصولوں کی روشنی میں مملکت کا نظام چلایا۔ ان میں ہر ایک نے اپنے حالات کے مطابق اسلام کے اصولوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا انطباق کیا۔ مگر اسلامی حکومت کے کوئی متعین خطوط نہ تھی کہ سربراہِ مملکت کے انتخاب کے متعلق بھی کوئی لگا بندھا طریق کار طے نہیں کیا گیا۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے حکومت کا کوئی خاص ڈھانچہ تجویز نہیں کیا ہے بلکہ اس معاملے کو ملت پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے اپنا طریقِ حکومت خود وضع کرے بشرطیکہ قرآن اور سنت کے اصولوں کی پیروی کی جاتی رہے۔ قریب کے زمانے میں متعدد مسلمان ممالک نے اس بات کا دعویٰ کیے بغیر کہ انہوں نے ایک ایسا اسلامی دستور مرتب کیا ہے جو تمام مسلمان ممالک میں نافذ کیا جا سکتا ہے، اپنی ضروریات کے مطابق کچھ دساتیر وضع کیے ہیں میرے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ پاکستان کو اپنے حالات پر اسلامی اصولوں کے انطباق کی شکل تجویز کرنی ہوگی۔ پھر یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ یہ کام جمہوریت کے مسلّمہ طریقوں پر ہونا چاہیے جن میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ ملک کے باشندے ملک کے معاملات میں حصہ دار ہوں۔ عوام کا یہ حق کہ وہ منظم ہوں اور اپنے معاملات کو خود چلائیں، ایک ایسا حق ہے جسے نہ تو کسی طرح محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی مصالحت کی جا سکتی ہے۔ کوئی فرد یا گروہ

خواہ وہ کتنا ہی ذی علم کیوں نہ ہو اس بات کا مجاز نہیں ہو سکتا کہ وہ قوم کی اُس رائے پر حکم بن کر بیٹھے جس کا وہ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ سے اظہار کرتی ہے۔ یہ سب باتیں اس امر کو طے کر دیتی ہیں کہ مجلسِ مقننہ کو بالاتری حاصل ہونی چاہیے جو عوام کے لیے عوام کی طرف سے کام کرے، اور اِس سے یہ بات بھی طے ہو جاتی ہے کہ عوام کو اپنے نمائندے اور حکومت کے لیڈر منتخب کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ نیز اس بات کا اطمینان کرنے کے لیے کہ انتظامیہ اور مقننہ دستور کے مطابق کام کر رہی ہیں، ایک آزاد عدلیہ کا قیام بھی ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس نظام میں مذہبی ماہرین کی کسی بالاتر جماعت کی گنجائش نہیں ہو سکتی جو مقننہ اور عدلیہ کے فیصلوں کو رد کرنے کا اختیار رکھتی ہو"۔

"اس معاملہ میں مَیں نے اسلام کے اصولِ اجماع سے بھی رہنمائی حاصل کی ہے جیسا کہ میں اس کو سمجھتا ہوں۔ ایک مکتبِ فکر کے نزدیک اجماع ان مجتہدین کی متفقہ رائے کا نام ہے جو اپنے علم کی بنا پر فیصلہ طلب مسئلے میں رائے ظاہر کرنے کے اہل ہوں۔ دوسرے مدرسۂ فکر کے نزدیک تمام مسلمانوں کی اکثریت جس بات پر متفق ہو جائے وہی اجماع ہے۔ پھر ایک تیسرا نظریہ یہ ہے کہ دَورِ جدید میں اجماع سے مراد مقننہ کی وہ رائے ہے جو وہ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور یہ اختیار علماء کی کسی جماعت کو نہیں بلکہ مقننہ کو حاصل ہے کہ وہ عوام کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے معاملات کے متعلق اپنی آزادانہ رائے دے۔ میں اِن سارے مسائل پر خود کوئی فیصلہ دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے یہ کام میں نے عوام کے نمائندوں پر چھوڑ دیا کہ وہی یہ طے کریں کہ قرآن وسنت سے تعلق رکھنے والے معاملات میں رائے قائم کرنے کی کیا شکل وہ پسند کرتے ہیں۔ البتہ مَیں نے یہ ضروری سمجھا کہ ایک اسلامی مشاورتی کونسل قائم کر دی جائے جس کی پُشت پر ایک اسلامی تحقیقی ادارہ ہو، تاکہ وہ مقننہ کو اسلام کی اساس پر قوانین بنانے میں مدد دے سکے" (ص ۱۹۸-۱۹۹)

ان تصریحات کے بعد وہ علماء کی طرف توجہ فرماتے ہیں:

"مجھے معلوم تھا کہ علماء اس انتظام سے مطمئن نہ ہونگے وہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ اسلام سے تعلق رکھنے والے معاملات میں تعبیر اور فیصلہ کا حق صرف انہی کو حاصل ہے۔ مگر یہ دعویٰ رکھنے کے باوجود انہوں نے ایک مفصل دستور بنا کر پیش کر دینے سے گریز کیا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ ایسی کوشش کرنے سے ان کے اندرونی اختلافات ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ اُن کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ حکومت ایک اسلامی دستور بنانا قبول کرے اور اس فیصلے کو علما پر چھوڑ دے کہ کونسا قانون اسلامی ہے اور کونسا غیر اسلامی۔ (ص ۱۹۹-۲۰۰)

اس کے بعد انہوں نے علماء کے سیاسی کردار پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ جو لوگ تحریکِ پاکستان کے مخالف اور قائداعظم کے دشمن تھے، پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد انہوں نے حصولِ اقتدار کے لیے چور دروازے سے داخل ہونے کی کوششیں شروع کیں اور اسلامی دستور کا نعرہ بلند کر کے اپنی گری ہوئی ساکھ کو بحال کرنے کا عزم کیا۔ اس سلسلے میں صدر محترم فرماتے ہیں:

"یہ وہ صورتِ حال ہے جس میں علماء نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اسلامی دستور کا مطالبہ پیش کیا۔ چونکہ کسی نے بھی اسلامی دستور کے بنیادی عناصر کا تعین نہیں کیا تھا اس لیے کوئی ایسا دستور اسلامی کہلانے کا مستحق نہ ہو سکتا تھا جسے علماء کی تبریک و تائید حاصل نہ ہو۔ اسلامی دستور کے نفاذ کا بس ایک ہی راستہ تھا کہ ملک علماء کے حوالہ کیا جائے اور پھر اُن سے التجا کی جائے کہ حضور براہِ کرم رہنمائی کیجیے۔ یہ تھی مختصر طور پر وہ بات جو علماء چاہتے تھے۔ کوئی دستور اُسی صورت میں اسلامی کہلا سکتا تھا جبکہ اُسے علماء مرتب کرتے اور پھر انہیں لوگوں کے معاملات کا حَکم اور منتظم بننے کا اختیار دے دیا جاتا۔ یہ بات نہ عوام کے لیے قابلِ قبول تھی اور نہ میں اسے ماننے کے لیے تیار تھا، کیونکہ یہ جمہوریت کے اِس بنیادی اصول کے خلاف تھی کہ اقتدار کا اصل منبع عوام ہیں (ص ۲۰۳-۲۰۴)

اس بحث میں صدر صاحب نے علماء کی دو اقسام کے درمیان واضح طور پر فرق کیا ہے۔ ایک سیاسی علماء دوسرے غیر سیاسی علماء۔ وہ فرماتے ہیں:

* میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں یہاں علماء کے اُس طبقے کا ذکر کر رہا ہوں جو علانیہ سیاست میں مشغول تھے۔ اُن خدا ترس لوگوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جنہوں نے قرآن کی تعلیم دے کر اور اسلام کے پیغام کی اشاعت کر کے بڑے ایثار، انکسار اور انہماک کے ساتھ قوم کی خدمت کی ہے۔ میں جن سیاسی علماء کی بات کر رہا ہوں وہ وہ لوگ ہیں جو مسلم قوم پرستوں کے مقابلے میں ہندی قوم پرست مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور یا تو انڈین نیشنل کانگرس کے ممبر تھے یا دوسری اُن جماعتوں اور تنظیموں میں شامل تھے جو کانگرس کی موافقت میں کام کر رہی تھیں۔ (ص ۲۰۱)

یہ اقتباسات خاصے طویل ہو گئے ہیں۔ مگر یہ ضروری تھا کہ اس مسئلے کے سارے پہلوؤں کے متعلق صدر صاحب کے نقطۂ نظر کو ان کے اپنے الفاظ میں پیش کیا جائے تاکہ لوگ اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ سکیں۔ اب جو سوالات اس پر پیدا ہوتے ہیں انہیں ہم مختصراً عرض کرتے ہیں۔

اوّلین سوال جو اس بحث کو پڑھ کر آدمی کے ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۶۱ء میں مسلم فیملی لاز آرڈی ننس کا نفاذ و اعلان کیا اُن اصولوں کے مطابق ہُوا تھا جو صدر صاحب نے خود ارشاد فرمائے ہیں؟ ان کا بیان یہ ہے کہ یہ اصول انہوں نے ۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء کو مرتب کیے تھے (ص ۱۹۶)۔ اور عائلی قوانین کا آرڈی ننس اس کے دو سال بعد نافذ کیا گیا۔ اس آرڈی ننس کی تاریخ اُنہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۶-۱۰۷ پر یہ بیان کی ہے کہ ۱۹۵۵ء میں چند فاضل اصحاب پر مشتمل ایک کمیشن مسلمانوں کے عائلی قوانین کے متعلق سفارشات پیش کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ پر سابق حکومت نے علماء کے خوف سے کوئی کارروائی نہیں کی۔ صدر صاحب نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد چند ممتاز قانون دانوں سے، جن میں جسٹس محمد ابراہیم اور سابق چیف جسٹس منظور قادر صاحب شامل تھے، اس کی سفارشات

(باقی ص ۹۵ پر)